جنت مکانی، وصال آشیانی ممتاز حسن مرحوم

1974ء

کوکب شادانی

ممتاز حسن صاحب بھی پچھلے سال اللہ کو پیارے ہو کر جنت مکانی وخلد آشیانی کہلانے لگے۔ ہمیشہ رہے نام اللہ کا۔ مندرجہ بالا مصراع سے مرحوم کا سن وفات نکلتا ہے۔ وہ بقول محترم ڈاکٹر آغا افتخار حسین صاحب اردو کے بلند پایہ ادیب تھے (کسی زمانے میں شعر بھی کہتے تھے، اور احسن تخلص فرماتے تھے) تاریخ میں اعلیٰ درجے کی بصیرت رکھتے تھے، آثار قدیمہ سے شغف تھا، فلسفہ پر اچھی نظر تھی، عربی کے فاضل تھے، جرمن اور کسی حد تک فرانسیسی زبانوں سے واقف تھے، مالیات و معاشیات کے متخصص تھے، ان کا مزاج شاعرانہ بھی تھا اور عالمانہ بھی، تصوف میں بھی دلچسپی رکھتے تھے اور معقولات میں بھی، فنون لطیفہ، موسیقی و مصوری سے لگاؤ تھا اور بیشتر علوم انسانی اور جمالیاتی فنون میں ان کی نظر میں گہرائی تھی اور گہرائی سے زیادہ گیرائی تھی۔

ڈاکٹر آغا افتخار حسین صاحب نے اپنے مضمون میں، جس کا اقتباس اوپر پیش کیا گیا، ممتاز حسن مرحوم کی جامع الکمالات شخصیت کی چند سطور میں جو قلمی تصویر پیش کی ہے وہ حرف بحرف درست اور مکمل ہے۔ ڈاکٹر صاحب موصوف نے یہ بھی بالکل بجا فرمایا کہ مرحوم کی رنگا رنگ شخصیت کے جس پہلو نے پاکستان کی تہذیبی زندگی کو سب سے زیادہ متاثر کیا وہ ان کی علم دوستی اور اہل علم وفن سے محبت تھی۔ اور یہ بھی حرف بحرف صحیح ہے کہ انہوں نے اداروں کی مدد کی اور افراد کی بھی، انہوں نے علمی ادارے قائم کئے اور اہل علم وفن کی صلاحیتوں کو زندگی عطا کی اور آج ہر علم دوست یقیناً ڈاکٹر صاحب کا اس سلسلے میں بھی ہمنوا ہے کہ علم و دانش کے محسن کی حیثیت سے

پاکستان کی تہذیبی تاریخ انہیں کبھی فراموش نہیں کرے گی۔

---

1. ممتاز حسن مرحوم از ڈاکٹر آغا افتخار حسین، روزنامہ جنگ کراچی 20 نومبر 1984

2. ایضاً

ممتاز حسن مرحوم کی کچھ انہیں سے ملتی جلتی خوبیوں کا ذکر برادر مکرم ضیاء الحسن موسوی صاحب نے بھی اپنے ایک فاضلانہ مضمون میں فرمایا ہے۔ نیز محترم مرزا علی اظہر برلاس صاحب نے مرحوم کی ان قابل قدر مساعی جمیلہ کا بھی تذکرہ کیا ہے جو تحریک پاکستان کے سلسلے میں مغفور نے کی تھیں۔ لاریب مرحوم نے اپنی پیشہ ورانہ صلاحیتوں میں بھی کمال حاصل کیا تھا اور اس سلسلے میں بھی ان کی خدمات کو فراموش نہیں کیا جا سکتا لیکن جیسا کہ مرزا برلاس صاحب نے ممتاز صاحب مرحوم سے خود ایک بار کیا تھا کہ ممتاز صاحب! میں نے بڑے افسر تو بہت دیکھے ہیں لیکن تو چیز ے دیگری اسی چیز ے دیگری کا ذکر میں اجمالاً زیر نظر مضمون میں کرنا چاہتا ہوں۔

ہر چند کہ ممتاز صاحب مرحوم کی وفات حسرت آیات پر اہل علم وفن کے علاوہ ہر وہ شخص جسے مرحوم سے ایک آدھ بار بھی ملنے کا اتفاق ہوا ہے آج تک اشکبار ہے، لیکن مخدومی پیر علی محمد راشدی صاحب نے جس طرح اپنے طرز خاص میں مرحوم کا سراپا پیش کیا ہے وہ اپنی جگہ یقیناً لاجواب ہے۔ لاریب اظہار غم کے لئے یہ تمثیلی طرز نگارش جس سے فراق اہل کمال کے بخشے ہوئے زخم نہ صرف رشنے بلکہ ہوا دینے لگتے ہیں، پیر صاحب جیسے اہل قلم ہی کا حصہ ہے۔ جو حضرات محسن علم وفن جناب ممتاز حسن صاحب مرحوم کے ساتھ راقم الحروف کے دیرینہ قلبی روابط سے واقف ہیں، ان کا اصرار ہے کہ میں بھی ان روابط کی روشنی میں مرحوم کے متعلق کچھ عرض کروں مگر پیر صاحب کے بقول حوصلہ نہیں رہا ہے بلکہ سچ پوچھئے تو اس عظیم قومی حادثہ پر ابھی دل ہی قابو میں نہیں آ رہا ہے لیکن

اگر دم در کشم قرشمکہ مغز و استخواں سر زد

جس وقت مجھے یہ اطلاع ملی کہ ممتاز حسن صاحب پر دل کا شدید دورہ پڑا ہے اور وہ شاید ہی جانبر ہوسکیں۔تو نہ پوچھئے کہ دل پر کیا قیامت گزر گئی۔ جی چاہا کہ پر مل جائیں تو اڑ کر ان کے پاس پہنچ جاؤں۔بستر سے اٹھا مگر لڑکھڑا کر رہ گیا۔ان دنوں اعصابی کمزوری اور جوڑوں کے درد کی وجہ سے چلنے پھرنے سے معذور تھا۔بہر حال یہ مصراع بے ساختہ زبان پر آیا۔

ہر حسد اجل ھیہات ممتاز حسن احسن

1394ھ

مجھے تاریخ گوئی سے کوئی خاص لگاؤ نہیں ہے۔احباب واعزا کے اصرار پر کبھی کبھی اس طرف توجہ کرنا پڑتی ہے اور بصد دشواری اس سے عہدہ برا ہوتا ہوں۔اس لئے مندرجہ بالا مصراع حسن سے ممتاز حسن مرحوم کا سال علالت و سال وفات دونوں ایک ساتھ نکلتے ہیں۔مرحوم سے راقم الحروف کے قلبی لگاؤ کا زندہ ثبوت ہے، ورنہ میری کوشش کو اس میں ذرا سا بھی دخل نہیں۔اس کے علاوہ جو دوسرے متعدد اردو، فارسی قطعات، اشعار، جملے، فقرے اور مصرعے، جس میں سے ایک زیر نظر مضمون کی سرخی ہے، انہیں بھی میں صرف مرحوم کے روحانی تصرف کا کرشمہ سمجھتا ہوں۔ان میں سے کچھ چیدہ چیدہ تاریخیں اس مضمون کے آخر میں درج کی جائیں گی۔اگر ان سب کی شان نزول بھی عرض کروں تو اندیشہ ہے کہ یہ مختصر مضمون طویل ہو جائے گا اور وہ زخم جو ھنوز تازہ ہے، اور ھرا ہو جائے گا۔

ممتاز حسن صاحب سے میری پہلی ملاقات جس عالم میں ہوئی، اسے آپ قیامت گردی کہئے یا عالم گردی کا تماشا تاھم وہ بھی ایک عجب عالم تھا۔ میں نے اورینٹل کالج لاہور کے ذریعہ پنجاب یونیورسٹی سے فارسی میں ایم اے پاس کرنے کے بعد ایم اے (انگریزی) کے لئے لاہور کے جس کالج میں داخلہ لینے کی کوشش

کی اس میں اندر سے باہر تک تل دھرنے کی جگہ نہ تھی۔ مقامی طلبا کے علاوہ باہر کے طالب علم بھی جوق در جوق چلے آرہے تھے اور ہر جگہ ان کے ٹھٹھ کے ٹھٹھ لگے ہوئے تھے۔ ایک نفسانفسی کا عالم تھا مگر یہ عالم بہشت کا سا عالم نہ تھا جو

کسے را با کسے عالم نباشد

کا مصداق ہوتا بلکہ یہاں ہر شخص دوسروں سے امداد کا خواہاں تھا اور داخلہ فارم کے لئے دفتر تک پہنچنے میں سبقت کی کوشش کر رہا تھا۔ اسی عالم میں مجھے متوسط قد کا سانولا سا ایک سنجیدہ صورت طالب علم نظر آیا مگر اس کا چہرہ سنجیدگی کے باوجود اس کی شگفتہ مزاجی کا اعلان کر رہا تھا۔ اس نے سفید براق شلوار قمیص پر نفیس قسم کا دھاری دار ہلکا گرم کوٹ پہن رکھا تھا۔ وہ بھی کالج کی عمارت کی طرف جا رہا تھا۔ میں نے نہ جانے کیوں اسے غور سے دیکھا تو وہ بھی میری طرف متوجہ ہو گیا اس کی توجہ کی وجہ ممکن ہے میرا لباس رہا ہو (میں نے علی گڑھ یونیفارم کا سیاہ ٹرکش کوٹ پہن رکھا تھا جس پر ظاہر ہے کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کا مونوگرام بھی تھا اور سر پر شیر گولہ کی ترکی ٹوپی بھی) واضح رہے کہ میرے اس لباس پر لاہور (جو اس زمانے میں ہندوستان کا پیرس کہلاتا تھا) کے کچھ ماڈرن قسم کے فیشن ایبل نوجوان طالب علم ناک بھوں بھی چڑھا رہے تھے مگر اس سادہ رخ طالب علم نے قریب آکر نہایت نرم اور شیریں لہجے میں مجھ سے پوچھا، میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟ میں اس کے لہجے کی شستگی اور روانی پر حیران رہ گیا۔ میں نے ذرا جھکتے مسکرا کر جی ہاں کہا تو میں نے اس سے اپنا مقصد بیان کیا اور اس نے میری خاطر خواہ مدد کی۔ میں اس کالج میں چند ماہ سے زیادہ کیوں نہ رہ سکا، وہ ایک الگ داستان ہے مگر اس طالب علم کے خلوص، انسانی ہمدردی اور خوش خلقی کا نقش ہمیشہ کے لئے میرے دل پر جم کر رہ گیا۔ یہ تھے بعد کے آقای دکتر ممتاز حسن (ستارہ پاکستان وغیرہ وغیرہ) جنہیں آج مرحوم کہتے ہوئے واقعی بڑا دکھ ہوتا ہے۔ مرحوم اپنی زندگی میں ایسے انمٹ نقش نہ جانے اور کتنے دلوں

پر چھوڑے ہوں گے۔

ایں سعادت بزور بازو نیست
تانہ بخشد خدائے بخشندہ

مرحوم سے میری ذرا گہری ملاقات، جس نے بعد میں پر خلوص دوستی کی شکل اختیار کر لی، علامہ اقبالؒ کی قیام گاہ پر ہوئی جو ان دنوں میکلوڈ روڈ لاہور پر تھی۔ ایک دن شام کو میں حسب معمول کچھ دوسرے حضرات کے ساتھ جن میں حضرت عبدالمجید سالک مرحوم بھی تھے، علامہ کی خدمت میں حاضر تھا کہ دیکھا ممتاز حسن صاحب چلے آ رہے ہیں۔ ان کے ساتھ ایک دوست بھی تھے جن کا نام اس وقت میرے ذہن میں نہیں ہے۔ مجلس اقبال کا رعب داب انتہائی سادگی کے باوجود کسی شاہانہ یا صوفیانہ دربار سے کم نہ تھا مگر وہاں بقول اقبال کے خادم خاص علی بخش کے شام کے وقت ہمیشہ دربار لگا ہو یا رہتا تھا اور آنے جانے کے لئے کوئی روک ٹوک نہ تھی۔ ممتاز صاحب چونکہ ملاقاتی کارڈ بھیجا تھا اس لئے وہاں سے باہر آنے کے بعد وہ علامہ صاحب کی سادہ مزاجی، کشادہ دلی اور درویش منشی پر حیران ہوتے رہے اور میں ان کی اصول پرستی پر دیر تک ہنستا رہا۔ اس دلچسپ واقع کا ذکر مرحوم نے کراچی کی ایک ادبی صحبت میں بھی کیا تھا جس کی وہ صدارت فرما رہے تھے۔

ممتاز صاحب نے بہت معصوم طبیعت پائی تھی۔ وہ ہر اپنے، بیگانے سے مل کر چھوٹتے ہی پوچھتے تھے۔ کہیے! میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟ ان کا یہ جملہ محترم مرزا علی اظہر برلاس صاحب کو ایک موقع پر ناگوار گذرا تھا مگر جیسا کہ موصوف نے اپنے محولہ بالا مضمون میں لکھا ہے وہ بعد میں خود بھی مرحوم کی سادہ مزاجی اور خلوص و معصومیت کے قائل ہو گئے تھے۔

میں نے جب دوسری عالمی جنگ کے دوران گورنمنٹ آف انڈیا کے محکمہ خوراک میں ملازمت کے لئے درخواست دی تو میرے پاس اس وقت کے

وزیرے خورک آنجہانی سری واستوا صاحب کے نام حافظ ابراہیم جیسے با اثر کانگرسی صوبائی وزیر کا تعارف خط تھا مگر چند روز تک کوشش کے باوجود وزیر موصوف کی خدمت میں بازیابی نہ ہوسکی تھی۔ اگر چہ میں ایسے معاملات میں سفارش کا نہ اس وقت قائل تھا نہ اب ہوں۔ اس کے علاوہ بہ لحاظ تعلیم و تجربہ جس عہدے کا خواہاں تھا اس کے لئے اپنی ذات میں کوئی خامی محسوس کرتا تھا نہ خود اعتمادی میں کوئی کمی جس کا سبق مجھے علامہ اقبال نے 1925ء دے چکے تھے اور اس کا ذکر میں اپنی کتاب مجلس اقبال (جلد دوم) کے پیش نظر میں کر چکا ہوں مگر اس وقت شیخ سعدیؒ کا شعر

در میر و وزیر و سلطاں را
بے وسیلت نگرد پیر امن

بار بار حافظے میں ابھر کر ذہنی الجھن کا باعث بنا ہوا تھا کہ ایک روز اسی محکمے میں اچانک ممتاز صاحب سے ملاقات ہوگئی۔ وہ ان دنوں حکومت ہند کے معاون مشیر مالیات تھے۔ دیکھتے ہی بولے، اوھو! کوکب صاحب کہیے میں آپ کی کیا خدمت کر سکتا ہوں؟ میں نے عرض کیا ممتاز صاحب! میں خود آپ کے محکمے میں عرض خدمت کے لئے حاضر ہوا ہوں۔ آپ مجھ سے یہ الٹا سوال کر رہے ہیں۔ مرحوم یہ سن کر ہنسے اور میرا ہاتھ تھام کر اپنے کمرے میں لے گئے اور بٹھا کر پہلے چپراسی کو چائے لانے کو کہا اور پھر فوراً ہی اسسٹنٹ سیکرٹری مسٹر مکرجی کو بلا کر میرے تقرر کا حکم دے دیا۔ اس کے بعد میں، جب تک دہلی میں رہا، ممتاز صاحب مجھ سے ہمیشہ اسی تپاک اور گرمجوشی سے ملتے رہے۔ مرحوم نجی تعلقات میں اپنے سرکاری بلند پایہ عہدے کا بالکل خیال نہیں کرتے تھے۔

کراچی میں، میں ایک دفعہ نوکر شاہی کی سازشوں کا شکار ہوا تو میں چھٹ بھیوں کی خوشامد کرنے کے بجائے براہ راست سر شوبرٹ سے ملا جو اس وقت وزارت خوراک و زراعت کے سیکرٹری تھے۔ اصل بات موصوف کی سمجھ میں آ گئی اور انہوں

نے میرے کیس کی فائل وزارت مالیات کو بھیج دی۔ نیز مجھے حکم دیا کہ ضرورت ہو تو میں براہ راست سرٹرنر سیکرٹری وزارت مالیات سے مل لوں۔ چند روز بعد مجھے معلوم ہوا کہ میرا کیس ممتاز حسن صاحب کے پاس ہے۔ مرحوم اس وقت وزارت مالیات کے ڈپٹی سیکرٹری تھے۔ چونکہ میں کراچی آ کر گھریلو معاملات میں ایسا الجھا تھا کہ ان کی خدمت میں حاضر نہ ہو سکا تھا۔ اس لئے ان سے ملنے میں شرم دامن گیر تھی۔ پھر یہ بھی سوچ رہا تھا کہ ممکن ہے کہ وہ دوسرے بڑے لوگوں کی طرح مجھے بھول چکے ہوں۔ میرے ایک قدیم و عزیز دوست ادیب سہارنپوری مرحوم کو جب اس کے متعلق معلوم ہوا تو وہ مجھے کشاں کشاں ممتاز صاحب کے پاس لے گئے اور جب میں ان کے کمرے میں پہنچا تو مرحوم نے پہلے مجھ سے مصافحہ کیا اور پھر ادیب سہانپوری مرحوم سے۔ پھر مسکرا کر مجھ سے فرمایا میں کراچی سے باہر گیا ہوا تھا۔ بہر حال میں نے آپ کا کیس دیکھ لیا ہے اور اس میں کچھ ایسی الجھن نہ تھی۔ میرے ہاں اس پر فیصلے میں اس قدر تاخیر و تعویق کی وجہ میری سمجھ میں نہیں آئی لیکن چونکہ اس دفعہ آپ کا کیس سر شوبرٹ کے دستخطوں سے آیا ہے، اس لئے مجھے اپنے نوٹ پر سرٹرنر سیکرٹری کے دستخط کرانا ضروری ہیں۔ آپ بے فکر رہئے میں اج ہی ان کے دستخط کرا کے فائل آپ کی وزارت کو واپس کرا دونگا۔ اور جب میں ان کا شکریہ ادا کر کے کرسی سے اٹھا اور کمرے سے باہر آنے لگا تو مرحوم بڑی شگفتہ مسکراہٹ سے بولے کوکب صاحب! مانا کہ آپ اس وقت میرے پاس اپنے کام سے آئے تھے مگر میرے بھائی چائے تو پیتے جایئے، ادیب سہانپوری مرحوم جو شروع ہی سے مرحوم سے میرا تعارف کرانے کے لئے الفاظ ڈھونڈ رہے تھے یہ دیکھ کر حیران رہ گئے۔ ممتاز صاحب مجھے ابھی تک بھولے نہ تھے۔

میں ایک دفعہ سخت بیمار ہوا تو ممتاز صاحب غریب خانہ پر بہ نفس نفیس میری عیادت کے لئے تشریف لائے۔ آج کل ممتاز صاحب کے برابر تو کیا، ان سے

کہیں کمتر سرکاری عہدہ داروں میں اس منکسر مزاجی اور انسانی ہمدردی کی مثال ملنی مشکل ہے

میں نے اپنی تصانیف کے سلسلے میں ہمیشہ ممتاز صاحب کے قیمتی مشوروں سے استفادہ کیا افسوس کہ اب

آں قدح بشکست و آں ساقی نماند

مرحوم کے انتقال سے کچھ عرصہ قبل میں نے ان سے اقبالؒ کے منتخب اشعار پر اپنی تصنیفات مجلس اقبال جلد دوم (اردو) پر اظہار خیال کے لئے گذارش کی تھی۔ مخدومی سید ہاشم رضا صاحب نے ازراہ کرم اس جلد پر بڑا گراں مایہ تعارف تحریر فرمایا ہے، مگر حیف صد حیف کہ ممتاز صاحب کے موعودہ مقدمہ سے اب یہ کتاب ہمیشہ محروم رہے گی۔

اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

محترم مرزا علی اظہر برلاس صاحب نے اپنے محولہ بالا مضمون میں ممتاز صاحب کی علمی و ادبی خدمات کے ساتھ ان کی قومی و ملی خدمات کا بھی ذکر فرمایا ہے۔ دراصل قومی و ملی بہبود کی مرحوم کے دل میں اقبالؒ کی طرح ایک عجیب تڑپ تھی اور مجھے ان کی یہی ادا سب سے زیادہ پسند تھی۔ میں نے اقبالؒ کی زندگی میں یہ شعر کہا تھا

ہے زمانے میں مسلم فلسفہ دانی تری
ہم کو پیاری ہے مگر رسم حدی خوانی تری

ممتاز حسن مرحوم اپنے دوستوں کو قومی و ملی خدمت کی کچھ اس انداز میں تلقین فرماتے تھے کہ ان کے اس جذبے پر بے ساختہ پیار آتا تھا۔ برادر محترم برلاس صاحب نے اپنے مضمون کے آخر میں ممتاز صاحب کے اسی جذبے کے پیش نظر عزیز لکھنوی مرحوم (عزیز مرحوم میرے استاد بھائی تھے) کا یہ شعر نقل فرمایا ہے

ہم سے جو کچھ ہو سکا دنیا میں وہ ہم کر گئے

اور کچھ کرتے اگر ملتی حیات مستعار

اس سلسلے میں مجھے آرزو لکھنوی مرحوم کا یہ شعر یاد آیا

یہی حد نہ تھی وفا کی کہ قضا پہ ختم کر دی
ابھی اور کیا نہ کرتے اگر اختیار ہوتا

سنجیدہ سے سنجیدہ انسان کی زندگی میں کبھی کبھی ایسے لمحات بھی آتے ہیں جب شگفتہ مزاجی اس کی سنجیدگی پر غالب آجاتی ہے۔ اقبالؒ نے شاید اسی لئے کہا تھا

لازم ہے دل کے ساتھ رہے پاسبان عقل
لیکن کبھی کبھی اسے تنہا بھی چھوڑ دے

ممتاز حسن مرحوم ہر چند صورت سے بڑے سنجیدہ نظر آتے تھے مگر جوش کی طرح بے تکلف دوستوں کی صحبت میں کبھی کبھی کوئی ایسا جملہ کہہ دیتے تھے کہ تھوڑی دیر کے لئے ساری محل زعفران زار بن جاتی تھی۔ زندگی رہی تو مرحوم کی زندگی کے ایسے لمحات پر جن کا تعلق زیادہ تر ان کے زمانہ طالب علمی سے ہے ایک جامعہ مضمون پیش کیا جائے گا۔

ممتاز مرحوم عمر میں مجھ سے صرف تین چار دن بڑے تھے۔ اگر کوئی کسی کے ساتھ جا سکتا تو میں ضرور ان کے ساتھ چلا جاتا مگر آہ!

مثل خوشبو وہ ہوا میں بہ گئے
ہم انہیں رونے کو تنہا رہ گئے

مرحوم بڑی ہمہ گیر شخصیت کے مالک تھے۔ ایسی ہمہ گیر شخصیت میں خال خال منصۂ شہود پر جلوہ گر ہوتی ہیں۔ مرحوم کی علمی، ادبی، تاریخی اور تحقیقی دستگاہ کے بارے میں کچھ عرض کرنا تحصیل حاصل ہوگا۔ انہیں کئی زبانوں پر عبور تھا۔ جس کا ذکر آپ زیر نظر مضمون کی ابتدائی سطور میں محترم آغا ڈاکٹر افتخار حسین صاحب کی زبان سے سن چکے ہیں۔ عربی تو وہ اچھی لکھتے اور بولتے تھے کہ یہ ان کا درسی مضمون تھا، مگر

جن حضرات نے انہیں جدید فارسی بولتے سنا ہے ان کا خیال ہوگا کہ مرحوم نے برسوں اس کی مشق کی ہوگی، مگر یہ راز سربستہ مجھے اور صرف مجھے معلوم ہے کہ اس کے لئے مرحوم کو صرف دو ہفتے کی مہلت ملی تھی۔ ہوا یہی کہ جب پہلی بار وہ ایک وفد کے ساتھ ایران جانے لگے تو ہر چند کہ پاکستانی وفد پر تقریر کرنے کے لئے فارسی زبان میں اظہار خیال کی پابندی نہ تھی، مگر انہوں نے وہاں جانے سے پہلے صرف دو ہفتے کے قلیل عرصے میں جدید فارسی بول چال ہی نہیں بلکہ علمی موضوعات پر تقریر کرنے کی ایسی دستگاہ بہم پہنچائی کہ اہل زبان بھی اس پر حیرت کا اظہار کئے بغیر نہ رہ سکے۔ یہ بات مجھے میرے عزیز دوست اور استاد بھائی ڈاکٹر عندلیب شادانی مرحوم نے بتائی تھی، جو اس پاکستانی وفد میں ایک رکن کی حیثیت سے شامل تھے۔ ہمارے ایرانی بھائی زبان کے معاملے میں بڑے شخص واقع ہوئے ہیں۔ ان کا یہ قول تو آپ نے سنا ہوگا کہ ہندوستان میں فارسی دانی کی ابتداء ایک ترک اچیں (امیر خسرو) سے ہوئی اور بہ کمال ایک ترک ایک (غالب) پر ختم ہو گیا مگر بقول عندلیب شادانی ان کے اس قول کی تردید بلکہ تغلیط غالباً پہلی بار ایک پاکستانی دانشور ممتاز حسن مرحوم نے کر دی۔ کسی غیر ملکی زبان میں اتنی عجلت سے کامل دستگاہ بہم پہنانا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ ممتاز صاحب سے پہلے برصغیر پاک و ہند میں اس کی مثال صرف ایک فرد واحد مولوی سید بلگرامی مرحوم کے ہاں ملتی ہے۔ موصوف کیمرج یونیورسٹی (انگلستان) میں سنسکرت کے پروفیسر تھے اور جیسا کہ اہل علم جانتے ہیں، کئی ملکی و غیر ملکی زبانوں پر عبور رکھتے تھے۔ یہی نہیں بلکہ لسانیت پر عبور رکھنے کی بناء پر نئی زبان کو ہفتے دو ہفتے میں اہل زبان کی طرح بولنے لگتے تھے۔ میں نے اپنے استاد گرامی پروفیسر سید اولاد حسین صاحب شاداں بلگرامی مرحوم (مولوی صاحب پروفیسر شاداں بلگرامی، مرحوم کے قریبی عزیز تھے) کی زبانی سنا ہے کہ ایک بار مولوی صاحب نے موسم کی چھٹیاں ہندوستان میں گذارنے کے بعد انگلستان جاتے

ہوئے پیرس میں چند ہفتے قیام کیا مگر وہاں پہنچتے ہی فرانس میں متعین روسی سفیر نے ان سے ملاقات کا اشتیاق ظاہر کیا۔ مولوی صاحب اس سے فرانسیسی، جرمنی، انگریزی، ہسپانوی، اطالوی، یونانی اور کئی دوسری غیر ملکی زبانوں میں جن پر موصوف کو عبور حاصل تھا گفتگو کر سکتے تھے مگر یہ بات ان کے دل کو نہ لگی۔ اس لئے انہوں نے سفیر موصوف سے پیرس میں پہلے سے اپنی مصروفیات کا عذر کر کے ایک ہفتے کی مہلت چاہی اور اس کے بعد جب ملاقات ہوئی تو مولوی صاحب (مصنف تمدن عرب و تمدن ہند) روسی سفیر سے اس کی زبان میں بے تکلف گفتگو کر رہے تھے، مگر ممتاز حسن مرحوم نے اس کے بعد پہلی بار اس کا ثبوت بہم پہنچایا کہ وہ اس سلسلے میں بھی اپنے پیشرو مولوی سید علی بلگرامی مرحوم سے کسی طرح کم نہیں تھے۔

ممتاز حسن مرحوم کی علمی و ادبی حیثیت پر مکمل روشنی ڈالنے کی اس مضمون میں گنجائش نہیں ہے۔ اس لئے ایک پوری کتاب درکار ہے۔ ہر چند کہ اکے بعد بھی بقول عرفی یہی کہا جائے گا کہ

زباں زنکتہ فرو ماند و راز من باقیست
بضاعت سخن آخر شد و سخن با قیست

اب آپ وہ تاریخیں سن لیجئے جو اپنے دیرینہ رفیق محترم ممتاز حسن صاحب مرحوم کی وفات حسرت آیات پر تاریخ گوئی سے کوئی خاص لگاؤ نہ ہونے کے باوجود پہلے ہی روز چند گھنٹوں کے دوران بے ساختہ میری زبان پر آئیں

(1) جنت مکانی جناب ممتاز حسن رحلت نمود (1974)

(2) محبّ! ممتاز حسن رحلت نمود (1394)

سید محبوب علی محبّ میرے دوست ہیں، جو ممتاز صاحب کی وفات کے روز میری عیادت کے لئے آئے تھے۔ انہیں دیکھتے ہی یہ جملہ میری زبان پر آیا

(3) حیہات کہ مجبی ممتاز حسن رحلت کرد (1974)

(4) عالی جناب ممتاز حسن کہ از جہان فانی رحلت نمود (1974)

(5) امروز خبر آمد ممتاز حسن بگذشت
آن صاحب علم و فن ہر شخص بر و فاخر
یک آہ کشیدم من زاں بعد بہ دل گفتم
ممتاز جہاں اول، ممتاز جہان آخر

(6) بود و جودش گہر ارض پاک
شد ھمہ کس پر اجاش سینہ چاک
گفت دلم بر لحدش ھم بہ اہ
دد شدہ ممتاز حسن زیر خاک

(7) جنت میں پہنچے ممتاز جس دن
یکلخت آئی بیگم کی آواز
ہم منتظر تھے کب سے تمہارے
ممتاز، ممتاز، ممتاز، ممتاز!

مندرجہ بالا تاریخوں وک میں محبی ممتاز حسن مرحوم سے اپنے قلبی لگاؤ اور مرحوم کے روحانی تصرف کا کرشمہ نہ کہوں تو کیا کہوں؟ اگر میرے اور ممتاز حسن مرحوم کے ایک مشترک دیرینہ رفیق حفیظ ہوشیارپوری مرحوم آج زندہ ہوتے تو میں ان سے بھی یہی سوال کرتا

وہ صورتیں الٰہی کس دیس بستیاں ہیں
اب جن کے دیکھنے و آنکھیں ترستیاں ہیں